بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

پنجابی زبان کا ایک مشہور محاورہ ہے کہ "ایک اور ایک مل کر گیارہ ہو جاتے ہیں"۔ یہ محاورہ اپنے اندر ایک فلسفیانہ گہرائی رکھتا ہے۔ اس میں نظریہ اجتماع کا ایک اہم اور بیش قیمت نکتہ مخفی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ دو افراد اگر متحد ہو جائیں تو ان کی قوت اس مجموعی قوت سے بڑھ جاتی ہے جو حالت اختلاف میں الگ الگ رہتے ہوئے ان دونوں میں پائی جاتی ہے۔ وحدت کے بغیر اگر وہ طاقت کے دو یونٹ رکھتے ہیں تو وحدت بجائے خود ایک ایسی قوت ہے جو ان کے اندر طاقت کے نو یونٹ اور بڑھا دیتی ہے۔ یہی فلسفہ ہے جسے ادب گاہ جبلت سے شہد کی مکھیاں اور چیونٹیاں اور پرندوں کی ڈاریں اور چرندوں کے غول سیکھ کر نکلتے ہیں اور اپنے بقاء و استحکام کا فطری فرض ادا کرنے کے لیے اس سے غیر معمولی طاقت اخذ کرتے ہیں۔ اور تو اور، ایٹم جیسے ذرۂ ناچیز کے مثبت اور منفی برقیات کا اتحاد انرجی کا ایک بھاری طوفان اپنے اندر لیے پڑا ہوتا ہے اور جب اس اتحاد کو توڑ دیا جاتا ہے تو وہ طوفان بہ نکلتا ہے۔ اب بکھر جانے والے برقیات اپنی اتحادی قوت کو گنوا کر بالکل بے جان اور کھوکھلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

انسان تو پھر بزم موجودات کا صدر نشین ہے۔ وہ فطرتاً اجتماعیت پسند اور ضرورتاً دوسروں سے مل کر رہنے پر مجبور ہے۔ اس سے زیادہ اس راز کا محرم اور کون ہو گا کہ وحدت تمدن کی ایک اہم ضرورت ہے۔ کون آدم زاد یہ نہ جانتا ہو گا کہ اتحاد ایک عظیم طاقت ہے۔ کس قوم سے یہ حقیقت مخفی ہو گی کہ باہمی رابطہ استحکام کا ذریعہ اور ارتقاء کا وسیلہ ہے۔ کس معاشرے کو اس سے انکار ہو گا کہ تعاون و توافق کے بغیر نہ ترقی ممکن ہے، نہ اپنا تحفظ ہی کیا جا سکتا ہے۔ کونسی ملت نہ چاہتی ہو گی کہ اس کی کتاب وحدت کا شیرازہ بندھا رہے اور اوراق بکھرنے نہ پائیں۔ کس گروہ نے یہ حسرت نہ کی ہو گی کہ وہ ایک بنیانِ مرصوص بن کر جنگاہِ حیات میں پیش قدمی کرے۔ ہر گھر، ہر خاندان، ہر بستی، ہر طبقہ، ہر پارٹی، ہر انجمن، ہر قافلہ، ہر قوم، ہر نسل، ہر معاشرہ

اور ہر سلطنت " اتحاد! اتحاد!" پکارتی نظر آتی ہے ۔ حتیٰ کہ ڈاکوؤں کا ایک جتھا بھی اجتماعیت کے اس بنیادی تقاضے کی اہمیت کو خوب محسوس کرتا ہے ۔ گھر کی چار دیواری سے لے کر مجلس اقوام متحدہ کے ایوان تک ہر جگہ انسان وحدت کا نغمہ الاپتا ملتا ہے ۔ یہاں تک کہ جب وہ باہم دگر دست و گریباں ہو رہا ہوتا ہے اور جب وہ اپنے ہی ابنائے نوع کا خون بہانے کے لیے تلوار سونتے نکلتا ہے تو اس وقت بھی کسی نہ کسی دائرہ اجتماع میں اس کی زبان وحدت و اتحاد کی تسبیح پڑھ رہی ہوتی ہے ۔

ہم مسلمانوں میں وحدت و اتحاد کے چرچے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی رہے ہیں ۔ ہمارے لیے یہ صرف فطرت و جبلت ہی کا پڑھایا ہوا سبق نہیں ہے ، بلکہ یہی خدا اور رسولؐ کی دی ہوئی تعلیم وحی بھی ہے ۔ ہمارے لیے یہ صرف وقت کی ایک ضرورت ہی نہیں ہے ، یہ ہمارا گم شدہ ورثہ ماضی بھی ہے ۔ ہمارے لیے یہ دنیوی تعمیر و ترقی کا لازمہ ہی نہیں ، عین دین ہے ۔ پس ہر لحاظ سے یہ ہماری ملی روح کی ایک زوردار طلب ہے جس سے ہم کسی لمحہ روگردانی نہیں کر سکتے ۔ چنانچہ پیچھے پلٹ کر اپنے سرمایۂ علم و ادب کو کھنگالیے ، ایتھر کی لہروں سے مذہبی خطبوں اور سیاسی تقریروں کی صدائے بازگشت سنئے ، مذہبی اور سوشل انجمنوں اور سیاسی پارٹیوں کی مجالس کی کارروائیوں اور قراردادوں کا تجزیہ کیجیے ، تحزب و تفرقہ سے نکل کر وحدت و اتحاد کے مقام گم شدہ کو از سر نو پا لینے کے لیے ایک مضطرب تمنا ہر جگہ کام کرتی ملے گی ۔ ہم باہم دگر مسلسل ٹوٹتے ہی چلے گئے ہیں لیکن ہماری ملی روح برابر " اتحاد ، اتحاد!" پکارتی رہی ہے ۔ ہم مذہب اور سیاست اور معیشت کے میدانوں میں اپنے ہاتھوں اپنا شیرازہ درہم برہم کرتے رہے ہیں ، لیکن ہمارا اجتماعی ضمیر متواتر " وحدت ، وحدت !" کی صدا لگاتا رہا ہے ۔

اور آج ـــــ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایک سلطنت ہمارے چارج میں دی ہے اور ہمیں آزادی و استقلال کے تخت پر بٹھا کر بھاری ذمہ داریوں سے دوچار کر دیا ، وحدت و اتحاد کی ضرورت کا احساس مزید شدت سے ہو رہا ہے ۔ جن خطروں کے اندر گھر کر ہم جی رہے ہیں ، ہمیں ان سے عہدہ برآ ہونا ہے ۔ ہمارے جگر کا ٹکڑہ ـــ کشمیر ـــ ہمارے سینے سے نوچ لیا گیا ہے ، اس کی بازیافت کا مسئلہ ایک مستقل کابوس بن کر ہمارے درپے ہے ۔ بعض طاقتوں کی مفسدانہ دست درازیاں ہیں کہ جن کا سدباب کرنا ہم پر واجب ہے ۔

ایک نوخیز مملکت کی حیثیت سے ہمیں اپنی معیشت کو بالکل بنیاد سے تعمیر کر کے کہیں کا کہیں لے جانا ہے۔ اپنا قومی کردار ہے جس کے دامن صد پارہ کی دھجیاں نئے سرے سے جوڑنی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اپنے اساسی نظریہ کو سے کر اس پر ایک ایک اینٹ رکھتے ہوئے ایک مختلف قسم کے نظام تمدن و سیاست کو برپا کرنا ہے۔ ہم گویا زندگی کی کسی بالکل اجاڑ سرزمین پر نوآبادکار بن کر اترے ہیں اور ہمیں اسے لہلہاتے کھیتوں اور باغوں میں بدلنا ہے۔ ہمارے سامنے ایک جہانِ نو اور ایک حیاتِ تازہ کو استوار کر دینے کی مہم ہے۔ ان بھاری ذمہ داریوں کو پھٹے ہوئے دلوں اور لڑتے ہوئے دھڑوں اور الگ الگ قبلوں کی طرف رُخ کرنے والے چہروں کے ساتھ سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ سامنے جو جہاد اپنی نفیر بجا رہا ہے وہ طوائف الملوکی کے عالم میں سر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مانگتا ہے سیسہ پلائی ہوئی انسانی دیوار! یہ چاہتا ہے ایک ایسی صف جس میں محمود و ایاز دوش بدوش کھڑے ہوں!

اتحاد، وحدت، تعاون، توافق، یک جہتی، یک آہنگی، باہم وابستگی کے مختلف ناموں سے ہم آپ جس شئے مطلوب کا تذکرہ کرتے ہیں اس کا سرچشمہ محبت ہے۔ محبت کے محرکات و موئیدات کچھ بھی ہوں لیکن دو آدمیوں میں کوئی حقیقی جوڑ اور کوئی گہرا رشتہ بغیر تارِ حریرِ محبت کے کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ بھی لازماً صحیح ہے کہ چند نفرت کرنے والے افراد کے جسموں کو آپ کسی ایک زنجیر میں جکڑ کر ان میں وحدت نہیں پیدا کر سکتے۔ آپ مختلف مکانوں میں رہ کر ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے اور ایک دوسرے پر عصبیتوں کے ہتھیاروں سے حملہ کرنے والوں کو کسی ایک کمرے میں بند کر کے تعاون و توافق کا درس نہیں دے سکتے۔ آپ شیشۂ حیات کے ٹوٹ جانے پر اس کی کرچیوں کو قانون کے لاسے سے نہیں جوڑ سکتے، اور آپ پھٹے ہوئے دلوں کو اختیار کے لٹھ کے زور سے محبت کا مسلک نہیں سکھا سکتے۔ اتحاد و تعاون خارج سے ٹھونسے جانے کی چیزیں نہیں ہیں، یہ تو اندر کے ایک فطری جذبے کے برگ و بار ہیں، وہ جذبہ زندہ ہو گا تو برگ و بار لائے گا، مردہ یا کمزور ہو گا تو کچھ پلے نہ پڑے گا!

ایک نہایت اچھی اور حد درجہ مطلوب شے کو حاصل کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن

سوال یہ ہے کہ اس کے لیے طریقہ معقول اور مفید، حکیمانہ اور نتیجہ خیز ہونا چاہیے، ورنہ اچھے سے اچھے مطلوب کو سامنے رکھ کر اگر غلط اسلوب سے اس کے درپے ہُوا جائے تو ایسے تجربات انجام کار مایوس کُن ثابت ہوتے ہیں۔ ان پر جو کچھ قوت اور دولت اور قابلیت صرف کی جاتی ہے، رائگاں جاتی ہے۔ اور ایک بار غلط نہج پر کیا کرایا اگر غارت چلا جائے تو پھر دوبارہ صحیح نہج سے کام کرنے کی ہمت مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس موضوع پر سوچنا چاہیں تو سب سے پہلے ایک نظر انداز شدہ حقیقت پر اپنی نگاہیں مرتکز کیجیے۔ وحدت و اتحاد کا مسئلہ ہماری ملی زندگی کے مجموعی مسئلے سے کٹا ہُوا کوئی الگ اور یکتا اور جزئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے سامنے بکھرے ہوئے تمام دوسرے مسائل کے ساتھ مربوط ہے۔ ہمارے سامنے جو مریض طالبِ علاج ہے اس کے مریض ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا پورے کا پورا نظامِ جسمانی حالتِ مرض میں ہے اور اس کے ہر ہر عضو کے فعل میں اختلال ہے اور اس لیے اس کا ہر عضو ایک نہ ایک مسئلہ سامنے لاتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے کہ اس کے ایک ایک عضو کے فعل کے مسئلہ کو باقی نظامِ جسمانی اور اس کے مسائل سے کاٹ کر الگ کر لیں اور باقی اعضا کو جوں کا توں اپنے حال پر چھوڑ کر اسی ایک عضو کی بحالی صحت کی مہم میں لگ جائیں۔ اس کا نظامِ ہضم خراب ہے، اس کا تنفس درست نہیں ہے، اس کا اخراجِ فضلات کا سسٹم بگڑا ہُوا ہے۔ اس کے قلب کی رفتار ڈھب پر نہیں آرہی ہے، اس کی نیند معیارِ اعتدال پر نہیں آتی، اس کے ہاتھ پاؤں میں حرکت کی سکت نہیں ہے، اب اگر طبیب علاج کا کوئی جامع منصوبہ بنائے بغیر محض تنفس یا دورانِ خون یا کسی دوسرے فعلِ جسمانی کے مسئلے کو بالکل الگ کر کے صرف اس کی تدبیرِ اصلاح میں لگ جائے تو مجموعی طور پر بحالیٔ صحت کا حصول تو دُور رہا خود وہ جزوی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا!

ٹھیک اسی طرح ہمارے نظامِ معاشرہ کی ہر ہر کل بگڑی ہوئی ہے۔ ہم خیالات و نظریات کی ایک انتشار افزا کشمکش سے گذر رہے ہیں، ہم بدترین قسم کی معاشی ناہمواریوں اور ظالمانہ طبقاتی تقسیموں

سے دوچار ہیں، ہمارا دفتری نظام چوپٹ ہو رہا ہے اور خیانت اور رشوت اور سفارش کے گھن اس چوبی محل کو کھا رہے ہیں، ہمارے جمہوری تقاضے اور ہمارے شہری حقوق چوراہوں میں پامال ہو رہے ہیں، ہمارے سیاسی، کاروباری، معاشرتی، سوشل اور مجلسی اخلاق کی چولیں اکھڑ رہی ہیں، ہمارے مذہبی اداروں اور گروہوں میں نہایت گھٹیا مقاصد اور نہایت ذلیل طور طریقے تیزی سے گھستے چلے جا رہے ہیں، ہماری سیاسی تنظیموں اور قیادتوں میں وہ روگ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے قومی عظمتوں کے فلک بوس محل ہمیشہ راکھ کے ڈھیروں میں بدل دیئے ہیں۔ اور پھر یہ تو ہماری اپنی آپ بیتی اور ہمارا اپنا قومی تجربہ ہے! جہاں پستی کی یہ ساری علامات موجود ہوں وہاں کون تصور کر سکتا ہے کہ ایک اتحاد و تعاون کا ہمہ گیر جذبہ لہریں لے رہا ہو گا۔ اور کون اس خیال آرائی کے بل پر وقت گزار سکتا ہے کہ یہ اور سارے تباہ کن روگ اپنے بدن میں پالتے ہوئے ہم اسے تحزب و تفرقہ کے دکھ سے نجات دلا سکتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں باہم دگر لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا درماں الگ سے نہیں کیا جا سکتا، بلکہ جب بھی کوئی مسیحائی کارگر ہو گی تو اس صورت میں ہو گی کہ پورے بدن کے فساد کو تشخیص کر کے اس کا کوئی ایک ہی بنیادی علاج اختیار کیا جائے۔

دوسرے لفظوں میں معاملہ درپیش ہے احیائے ملت کا اور اپنی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا! مسئلہ سامنے ہے اپنے مرکزی شرار حیات (SPARK OF LIFE) کو از سر نو مشتعل کرنے کا، اور عزائم کے دیوں کی لو اونچی کرنے کا! جس قومی مسئلہ کو بھی لیجیے وہ آپ کو پھر پھرا کر یہیں لے آئے گا۔ آج ہو یا پچاس برس کے بعد، موجودہ حالت سے ہماری نجات پوری زندگی کو ادھیڑ کر از سر نو بننے میں ہے، کسی اور جزئی منصوبے میں نہیں!

ملت کی تعمیر نو اور زندگی کی تجدید اور تہذیب کے احیاء کا جامع سوال سامنے آ جانے پر سوچنا یہ ہو گا کہ ہمیں زندگی و قوت دینے والی اور ہمیں جوڑ کر ایک بنانے والی چیز کیا تھی اور کیا ہے؟ بعض معاشرے وہ ہیں جن کے اندر نسلی نعرے سے گرمی حیات پیدا ہوتی ہے، بعض وہ ہیں جن کے اندر وطن کی پکار سنتے ہی زندگی کروٹیں لینے لگتی ہے، بعض کے اندر طبقاتی بلاوا گرمی خون پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی گروہ ایسے

بھی ہیں جو اپنے ماضی سے نئی روح لے کر آگے بڑھتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ماضی کا سارا پشتارہ دریا بُرد کیے بغیر ایک انچ بھر اقدام نہیں کر سکتے، پھر وہ بھی ہیں جن کے لیے ان کی مذہبی اسپرٹ ہی محرکِ ارتقا ہو سکتی ہے اور وہ بھی ہیں جو مذہب کی بیڑیاں کاٹے بغیر نئی زندگی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ سوچنا یہ ہے کہ ہم کس نوعیت کے لوگ ہیں۔

ہماری ملّی زندگی کا ساری زمین پر سایہ پھیلا دینے والا طوبیٰ جس بیج سے پھوٹا ہے وہ خدا پرستانہ نظریۂ حیات ہے۔ اسی نظریے سے ہماری ایک ایک ٹہنی اور پتّے کو غذا ملتی ہے اور ہماری ساری جڑوں کا مرکز یہی ہے۔ اسی نے صور پھونک کر ہمیں جاہلیت کے قبرستان سے اُٹھایا، اسی نے ہمیں ارادے اور جذبے دیئے، اسی نے ہمیں علم و حکمت سے مالا مال کیا، اسی نے ہمیں تسخیر اور جہاں بانی کے قابل بنایا اور اسی نے جاہلی عصبیتوں کے پنجروں سے نکال نکال کر ہمیں ایک عالمی نظامِ اخوت کی لڑی میں پرو دیا۔ ہمیں جو چیز جوڑتی ہے وہ صرف یہ شعور ہے کہ ہمارا خدا ایک ہے، ہمارا رسولؐ ایک ہے، ہمارا قبلہ ایک ہے، ہمارا مسلکِ حیات ایک ہے، ہماری اخلاقی قدریں ایک ہیں، ہمارا معیارِ خیر و شر ایک ہے۔ ہم جس ایمان و شعور سے باہم دگر بندھے ہیں وہ وحدتِ الٰہ، وحدتِ حیات، وحدتِ آدم اور وحدتِ عالم کے تصورات پر مشتمل ہے۔ اس ایمان و شعور سے سرشار ہو کر جب ہم کہتے ہیں کہ "ہم مسلمان ہیں" تو ہمارے درمیان کے تمام نسلی و وطنی، طبقاتی و لسانی، گروہی و فرقہ دارانہ حائلات اُٹھ جاتے ہیں اور ہم جسمِ واحد بن جاتے ہیں۔ پھر جب ہم سارے انسانوں کی بھلائی کا نصب العین اختیار کر کے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جہانی پروگرام لے کر میدانِ عمل میں نیکی اور انصاف اور مساوات کے سپاہی بن کر اترتے ہیں تو ہمارے اندر کے تمام جاہلی امتیازات تحلیل ہو جاتے ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ترکیہ سے انڈونیشیا تک ہم ایک ہی اجتماعی تشخص رکھتے ہیں۔ جہاں یہ ایمان و شعور کمزور پڑتا ہے تو فوراً ہمارے اندر سے ملکی، وطنی، نسلی، طبقاتی علاقائی اور لسانی عصبیتیں اُبھر آتی ہیں اور طرح طرح کی مفاد پرستیاں سر اٹھانے لگتی ہیں اور ہمارا ملّی شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اب اگر پوری حیاتِ ملّی کا احیا مطلوب ہو اور بالخصوص وحدت و اتحاد کی طاقت حاصل کرنے کی تڑپ ہم میں ہو تو ہمیں ایک بار پھر اسلام کے دیئے ہوئے ایمان و شعور کی صہبا میں سرشار ہو کر

جہانی فلاح کے نصب العین پر بازی لگا دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونا ہوگا : اس ایمان و شعور پر ہمیں اپنا دستورِ مملکت استوار کرنا ہوگا اور اسی کے مطابق نظامِ تعلیم اور نظامِ معیشت استوار کرنا ہوگا — یہ نہیں تو وحدت و اتحاد کے ہزار سپنے دیکھیے اور لاکھ تدبیریں آزما ڈالیے ، معاملہ سو سال بعد بھی وہیں رہے گا ، جہاں آج ہے ۔

یہ حقائق ہیں جن کو سامنے رکھ کر پاکستان کے باشندوں میں اتحاد پیدا کرنے کی اُن اسکیموں اور تدبیروں کا جائزہ لیا جانا چاہیے جن کو ایسے لوگ سے کے اُٹھے ہیں جو خود گوناگوں عصبیتوں اور مفاد پرستیوں کے جام چڑھا کر ہر لمحہ بدمست رہتے ہیں اور آئے دن جوڑ توڑ اور سازشوں میں مصروف رہتے ہیں ۔ اگر ہمارے مکتبِ سیاست میں ایسے معلّم مسندِ درس پر بیٹھے اختیار کے ڈنڈے سے عوام کو درسِ محبت دیتے رہے تو " کارِ طفلاں تمام خواہد شد " کے سوا اور کیا نتیجہ نکلے گا ! اختلاف ہمیں اس سے نہیں کہ " درسِ محبت " نہ دیا جائے ، آپ کے خیر اندیش کڑھتے اس پر ہیں کہ کرنے کا کام غلط ڈھنگ سے کیا جا رہا ہے ۔ ہم سے پوچھیے تو پورے پاکستان ، بلکہ پورے عالمِ اسلام کو ون یونٹ ہونا چاہیے ، لیکن دلوں اور دماغوں اور روحوں میں نظریہ و مقصد کا جوڑ لگائے بغیر محض جسموں کو باہم دگر باندھ کر یا الگ الگ مکانوں کی بیچ کی دیواریں اٹھا کر اور ان کو ایک ہی ہال میں بدل کر حقیقی معنوں میں ایک محلّے کا بھی ون یونٹ نہیں بنایا جا سکتا !